Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 6, Issue 4
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

Research Article

ڈاکٹر سدرہ طاہر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان۔
ڈاکٹر شیما سعدیہ
ٹیچر ایڈ، سپروس ایلمنٹری سکول، ساؤتھ سان فرانسسکو، کیلیفورنیا، امریکہ

حسن منظر کے ناول "حبس" کا فکری و نفسیاتی تجزیہ

Dr. Sidra Tahir
Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad, Pakistan
Dr. Sheema Saadia
Teacher, aide spruce elementary school, south san francisco california, America

A Philosophical And Psychological Study Of Hasan Manzar's Novel "Habs"

Received: Oct 2, 2025
Accepted: Nov 20, 2025
Published: Dec 30, 2025

This research article Highlights a psychological and philosophical analysis of Hasan Manzar's significant novel Habs (حبس), which portrays the mental turmoil of the novel's main character "Ariel Sharon" the former Israeli Prime Minister, during his years-long coma. As a psychiatrist, Hassan Manzar skillfully explores the complexities of human conscience, subconscious repression, guilt, and psychological trauma. Although this novel has been gained political and moral attention in Urdu literary circles but it still lacks a comprehensive psychological analysis. The research is grounded in Sigmund Freud's theories, particularly the unconscious, defense mechanisms, and guilt. Using interpretive and analytical methods, the study examines the protagonist's internal conflict, symbolic visions, recurring dreams, and the resurfacing of suppressed memories. The findings reveal that Sharon, once empowered by violence and supremacist ideology, ultimately becomes a victim of his own subconscious torment. "Habs" is not merely a narrative of historical injustice but a psychological elegy on the disintegration of the self, the awakenings of moral conscience, and the burden of repressed atrocities.

Keyword: Habs, Hasan Manzar, Psychoanalysis, Freud, Unconscious, Guilt, Consciousness, Violence.

انسان کی زندگی اور اس کے وجود کی بقا کا گہرا تعلق اس کے سماج سے ہے۔ ادیب یا شاعر جو کچھ بھی تخلیق کرتے ہیں، وہ دراصل ان کے عہد کے معاشرتی، تہذیبی اور فکری پس منظر کا عکاس ہوتا ہے۔ داخلی کیفیات پر خارجی ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ادب کا مطالعہ سماجی عناصر اور انسانی رویّوں کی تفہیم کے بغیر ممکن نہیں۔ کوئی بھی ادیب اپنے عہد

کی سماجی ساخت، طرزِ زندگی، اور اجتماعی رویّوں سے مکمل طور پر لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول جیسی بیانیہ صنف میں معاشرتی مسائل، انسانی کشمکش اور فکری تضادات کا شامل ہونا ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔ حسن منظر کا شمار اردو کے ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں اپنے عہد کے سماجی، نفسیاتی اور فکری مسائل کو گہرائی سے موضوع بنایا۔ان کی تحریریں انسانی ذہن، ضمیر اور سماج کے باہمی تعلقات کو باریک بینی سے اجاگر کرتی ہیں۔

حسن منظر کا ناول "حبس" گو کہ اپنے دامن میں تاریخی حقائق کو سموئے ہوئے ہے لیکن یہ محض ایک سیاسی یا تاریخی بیانیہ نہیں بلکہ انسانی نفسیات اور ضمیر کی پیچیدگیوں کا ایسا تخلیقی اظہار ہے جس میں ماضی کی ہولناک یادیں، احساسِ جرم، تحت الشعور کی بیداریاں اور نفسیاتی کشمکش کو حقیقت سے قریب تر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اسرائیل کا سابق وزیر اعظم ایریئل شیرون ہے (اس کی ماں "دیوورا" روسی جب کہ باپ "شموئیل شیز مین" یدش ہے) جو کوما میں ہونے کے باوجود اپنے شعور و لاشعور میں قید؛ مجرمانہ ماضی کا سامنا کرتا ہے۔ حسن منظر خود بھی ماہر نفسیات ہیں، اور یہی ان کے اسلوب میں کردار کی ذہنی پیچیدگیوں کو بیان کرنے کی مہارت کا باعث بنتی ہے۔ زیر تحقیق مقالے میں نفسیاتی حوالے سے ناول پر فرائیڈ کے نظریات کا اطلاق کرتے ہوئے ایریئل شیرون کی شخصیت اور اس کے نفسیاتی رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خواب، ماضی کی بازگشت، اور ذہنی تصادم ایسے عناصر ہیں جو اس کے تحت الشعور کی عکاسی کرتے ہیں۔ کوما کی حالت میں بھی اس کے ذہن میں جاری فلمی مناظر اس کے ضمیر کی بیداری کا ثبوت ہیں۔ مقالہ حسن منظر کے فکری پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ناول میں ظلم، طاقت، اور استعمار کے فلسفیانہ نتائج کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایریئل شیرون جیسے کردار کو محض ظالم کے طور پر نہیں بلکہ انسانی وجود کے انہدام، اخلاقی زوال، اور ذہنی شکست کے پیکر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو بالآخر اپنے ہی ضمیر اور تحت الشعور کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے۔

ناول "حبس" کا پلاٹ بظاہر آٹھ برسوں پر محیط ہے، جو اسرائیل کے سابق وزیر دفاع اور گیارہویں وزیر اعظم ایریئل شیرون کی کوما کی حالت میں گزری زندگی پر مرکوز ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب وہ دنیا سے کٹا ہوا ہے، لیکن اس کا ذہن، لاشعور اور یادداشتیں اس کے ماضی میں کیے گئے تمام مظالم کو دہرا رہی ہیں۔ حسن منظر نے اس کیفیت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ایریئل شیرون کے ذہنی مناظر اور فلیش بیکس گویا ایک ایسی فلم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جسے وہ دیکھنا نہیں چاہتا، مگر دیکھنے پر مجبور ہے۔ یہ فلم درحقیقت اس کے لاشعور کی زبان ہے، جس میں اس کے ماضی کے مظالم، مظلوموں کی چیخیں، قتل و غارت، اور تباہ شدہ بستیاں، بار بار اس کے سامنے آتی ہیں۔ یہ فلم نہ صرف ایک مجرم کے ذہنی عذاب کی نمائندہ ہے بلکہ انسانی تاریخ کے ان سیاہ ابواب کی بھی یاددہانی ہے جو طاقت کے نشے میں لکھے گئے۔

ایریئل شیرون ۲۰۰۵ء میں دماغی شریان پھٹنے کی وجہ سے ہسپتال میں لایا جاتا ہے کچھ دن کے بعد ہی ہسپتال کو خیر باد کہہ کر چلا جاتا ہے۔ مگر دوسرے حملے کے بعد اسے دوبارہ ہسپتال منتقل کر دیا جاتا ہے۔ حسن منظر نے شیرون کے دور حکومت کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ سارے واقعات قاری کی آنکھوں میں اتر جاتے ہیں۔ اگرچہ ناول کے ظاہری بیانیے میں اسرائیلی ریاست کے جرائم اور فلسطینیوں کی مظلومیت نمایاں ہے، لیکن اس کا مرکزی نقطۂ نظر سیاسی سے کئی زیادہ نفسیاتی ہے۔ یہی "حبس" کو روایتی بیانیہ ناول سے الگ کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا کہا درست ہے:

"اس ناول کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ اردو زبان میں ہے اگر یہ ناول انگریزی یا کسی اور اہم زبان میں ہوتا تو یقیناً نوبل انعام کا حق دار ٹھہرتا۔"(۱)

حسن منظر چونکہ خود ایک ماہر نفسیات ہیں، اس لیے وہ ایریئل شیرون کی داخلی نفسیات مثلاً اس کے اندرونی خوف، احساسِ جرم اور لاشعور میں دبی ہوئی یادداشتوں کو گہرائی سے سمجھتے ہیں اور فنکارانہ انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے مکالمے، فکری تصاویر اور مناظر محض فکشن نہیں بلکہ ایک نفسیاتی دستاویز بن جاتے ہیں۔ یہ نفسیاتی کیفیت سگمنڈ فرائیڈ کے اس تصور کی توثیق ہے کہ لاشعور (Unconscious) میں دبے ہوئے جذبات، احساس جرم (Guilt) اور ناخوشگوار یادیں، شعور سے دور ہونے کے باوجود فرد کے رویوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ فرائیڈ کے بقول:

"The unconscious is the true psychical reality; in its innermost nature it is as much unknown to us as the reality of the external world." (۲)

ایریئل شیرون کی یہ ذہنی حالت محض یادداشت کی بازگشت نہیں بلکہ اس کے ضمیر کی عدالت کا کربناک بیانیہ ہے، جہاں وہ بے آواز گواہوں اور خاموش کرداروں کی موجودگی میں خود کو کٹہرے میں کھڑا پاتا ہے۔ اور مسلسل اس فلم کے بند ہو جانے کے لیے دعا گو ہے۔ حسن منظر اس کیفیت کو غیر معمولی نفسیاتی گہرائی سے بیان کرتے ہیں۔ ناول میں اس کی یہ حالت بار بار پیش کی گئی ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں موشے (موسیٰ) کے خدا کو نہیں مانتا ہوں۔ پھر بھی میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بہت سے کاموں کی سزا نہیں دی۔ Good-bye dear God, stay where you are. کل ایسے سین مجھے مت دکھانا۔"(۳)

ناول کے اس حصے میں شیرون بارہا ان خوابوں اور مناظر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے ماضی کی ظالمانہ کارروائیوں کی یاد دلاتے ہیں، مگر وہ ان سے بچ نہیں پاتا۔ اس کی یہ کیفیت نفسیاتی اصطلاح میں "repetition compulsion" کی نمائندگی کرتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنی کتاب Beyond the Pleasure Principle (1920) میں اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے اس کا مفہوم ہے کہ فرد لاشعوری طور پر اپنے ہی ماضی کے تکلیف دہ تجربات کو دہراتا ہے اور یہ سب وہ خوشی سے نہیں کرتا بلکہ اس کی مختلف وجوہات میں سے اندرونی کشمکش اور ضمیر کی خلش بھی ہو سکتی ہیں۔(۴) شیرون چاہتا ہے کہ یہ اذیت ختم ہو جائے، مگر اس کا ضمیر اسے یہ اجازت نہیں دیتا۔

"مجھے میری مرضی کے خلاف کیلنڈر کے وہ اوراق دکھائے جا رہے ہیں۔۔۔ ستمبر 16، 17، 18۔ کاش میں اپنی آنکھوں کو پھوڑ سکتا۔"(۵)

"ان آوازوں کو ہاسپٹل سٹاف نہیں سن سکتا ہے۔ کبھی میرے ہاتھوں یا میرے حکم پر ماری جانے والی عرب عورتوں کے لمبے بال میرے چہرے کو چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی بے ربط مooویز کے ٹکڑے مجھے سامنے کی دیوار پر دکھائے جاتے ہیں جنھیں میں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں، پر دیکھنا پڑتا ہے اور تعجب اس امر پر ہے کہ اس مووی پر نہ کسی ڈاکٹر کی نظر پڑتی ہے نہ نرس کی۔"(۶)

یہ منظر نامہ فرائیڈ کی نفسیات کا بنیادی نکتہ ہے کہ انسان کے دبے ہوئے گناہ کسی نہ کسی شکل میں واپس آتے ہیں خصوصی طور پر جنہیں وہ بھولنا چاہتا ہے۔ حسن منظر نے ایسے مؤثر مکالمے اور مناظر تخلیق کیے ہیں کہ قاری بھی اس کردار کی ذہنی اذیت کو محسوس کر سکتا ہے لیکن اسے ترس نہیں آتا کیوں کہ اس کی یہ ذہنی حالت اس کے سنگین مظالم کے سامنے کچھ بھی نہیں جو اس نے انسانیت پر کیے ہوتے ہیں۔ صرف مکالمے اور مناظر ہی نہیں مصنف نے ایریئل شیرون کا خاکہ بھی ابتدائی طور پر ہی تمہیدی زمرے میں اس طرح قلم بند کیا ہے کہ قاری بسترِ مرگ پر موجود اس شخص کو اپنے پورے وجود کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔

"باریک سرخ بالوں اور بھوری آنکھوں والا خدا کا منکر یہودی، روسی ماں باپ کا بیٹا ہے۔ اسے اس کے دوست ایرک کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے اپنے پرائے سب کے لیے وہ بلڈوزر ہے۔"(۷)

بلڈوزر کی علامت اس کردار کی عکاسی کے لیے بہترین ہے جو احساسات و جذبات سے عاری ایسی مشین کی طرح کام کرتا ہے جو اپنی راہ میں آنے والے معصوم بچوں پر بھی رحم نہیں کرتا۔ ایریئل شیرون کے لیے یہ علامت محض ایک عسکری شناخت نہیں بلکہ اس کی بے رحمی اور انسانی قدروں سے بیگانگی کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ تاہم ناول کی معنوی ساخت میں یہی بلڈوزر بالآخر ایک نفسیاتی چکرویو کا شکار ہو جاتا ہے، جہاں طاقت کی یہ علامت خود اپنے ہی ضمیر کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ شیرون کو انہی مظلوم فلسطینیوں کی چیخ و پکار اب سونے نہیں دیتی۔

فکری سطح پر حسن منظر نے فلسطینیوں کی حب الوطنی کی ایسی عمدہ مثال پیش کی ہے جو پچھلے کئی برسوں سے ظلم برداشت کرنے کے باوجود اپنی زمین سے جڑے ہوئے ہیں وہ زمین جس کی عمارتوں، ہسپتالوں، تعلیمی اداروں اور سڑکوں کو بارود کی نذر کر دیا گیا۔ ایسی زمین جس کی انہوں نے ہزارہا سال خدمت کی اسے بنجر کر دیا، فصلوں کو تباہ کر دیا گیا۔ ایریئل شیرون کو اسی کی آواز یاد دلاتی ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ کس طرح فلسطین نے مظالم برداشت کیے مگر ہمت نہ ہاری۔ بقول حسن منظر:

"فلسطینی انسانی تاریخ کی سب سے طویل اور شدید جارحیت کے بعد بھی یہاں موجود ہیں اور رہیں گے کیونکہ ان کا زمین کی خدمت اور آزادی میں ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا ہے نہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں۔ جنہوں نے اس زمین کو ہزاروں سال آباد رکھا، بنجر ہونے سے بچایا۔ ان سے تیرے لوگ چھین رہے ہیں لیکن جس طرح امریکی ویت نام ایک دن خاموشی سے خالی کر گئے تھے۔ جاتے جاتے فلسطین کی چھاتی پر تم بھی یورینیم ڈسٹ چھڑکتے جانا جس طرح عشق میں ناکام ہیرو محبوبہ کے چہرے پر تیزاب چھڑک کر بھاگ جاتا ہے۔"(۸)

یہ اقتباس فلسطینیوں کی عظمت اور ان کی اپنی زمین سے روحانی وابستگی کو شیرون کی ضمیر کی آواز کے ذریعے اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ ظلم کی ہر صورت تاریخی اور فکری تناظر میں اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ اقتدار اور جبر کی بالادستی فلسطینیوں کے عزم و ہمت اور ان کی استقامت کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ ایک مقام پر شیرون کے سامنے وہی منظر ابھرتا

ہے جس میں مائیں کچلے گئے بچوں کو گود میں اٹھا کر زندگی لوٹانے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔"کتنی ہی جوان ماؤں نے بوٹوں تلے کچلے ہوئے بچوں کو زمین سے اٹھایا اور ان کے منہ میں تھن دینے کی کوشش کی "(۹)

ایریئل شیرون کے لاشعور میں ابھرنے والے مناظر محض خواب یا یادداشتیں نہیں بلکہ اس کے جرائم کا وجودی احتساب بھی کرتی ہیں۔ فلسطینی عورتوں اور بچوں پر ڈھائے گئے مظالم اس کے ذہن میں اس طرح نمودار ہوتے ہیں کہ یہ مناظر فرد کے لاشعور سے بڑھ کر انسانی ضمیر کی انتقامی قوت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ناول میں یہ صورت حال مابعد الطبیعیاتی عذاب کی کیفیت کے طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں پر پال ریکوئر کا تصورِ شر نہایت بامعنی ہو جاتا ہے۔ پال ریکوئر اپنی کتاب The Symbolism of Evil میں شر (Evil) کے تصور کو محض کسی سیاسی، سماجی یا قانونی جرم کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے انسانی وجود کی گہرائیوں سے وابستہ ایک علامتی اور اخلاقی تجربے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک شر کا اصل اظہار قوانین کی خلاف ورزی سے زیادہ اس کی پامالی (defilement) میں ہوتا ہے جو انسان کے باطن اور ضمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ ریکوئر نے مختلف تہذیبوں اور مذہبی روایات میں شر کو گناہ اور اخلاقی زوال کی علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے جو انسانی وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

"Evil is not only the violation of a rule but a defilement which infects the whole of existence"(۱۰)

یہ نظریہ ناول "حبس" کے مرکزی تجربے سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ ایریئل شیرون کے لیے اس کے مظالم کسی دنیاوی عدالت میں زیرِ سماعت نہیں بلکہ اس کے اپنے وجود میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظلم کے فلیش بیک مناظر اس حد تک علامتی شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ کردار کے پورے شعور، لاشعور اور وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ شیرون کے کردار کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ جب کسی قوم کو غیر انسانی تصور کر لیا جائے تو عورت، بچے اور بوڑھے سب یکساں ہدف بن جاتے ہیں۔

مغربی دنیا جو جانوروں تک کے حقوق محفوظ رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ کئی عشروں سے فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم و ستم پر خاموش ہے۔ ناول میں امریکی کردار کو محض پس منظر میں نہیں رکھا گیا بلکہ اسے عالمی استعمار کے نمائندہ استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ امریکہ جو انسانی حقوق کا علمبردار ہونے کا دعوے دار ہے، فلسطین کے معاملے میں ایک ایسی قوت کے طور پر سامنے آتا ہے جو نام نہاد ہمدردی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ ناول میں اقوام متحدہ کو امریکہ کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے سے تشبیہ دے کر عالمی طاقت کے دوہرے معیار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ بیانیہ ناول کو محض ایک فکشن نہیں بلکہ نوآبادیاتی سیاست اور عالمی منافقت پر کی جانے والی تنقید میں تبدیل کر دیتا ہے۔

"ان کے لیے نہ خدا کے آسمان میں راہ ہے، نہ زمین میں، نہ پانی پر اور یہ سب کچھ نہ امریکہ کو نظر آتا ہے اور نہ ان تمام ملکوں کو جو اس کے دوست ہیں۔"(۱۱)

یہ صورتِ حال ایڈورڈ سعید کے افکار کی روشنی میں مزید واضح ہو جاتی ہے۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق امریکہ کا اسرائیل کی طرف واضح اور غیر مشروط جھکاؤ محض ثقافتی یا مذہبی قربت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک منظم، مربوط اور تاریخی کردار کا تسلسل ہے جو مغرب نے مشرق کے خلاف اختیار کر رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"امریکہ کا اسرائیل کی طرف جو واضح جھکاؤ موجود ہے وہ ابھی تک پوری طرح جاری و ساری ہے۔ یہ جھکاؤ کیوں موجود ہے۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ ثقافتی طور پر اس کی جڑیں یورپ میں بالعموم اور امریکہ میں بالخصوص بہت گہری ہیں۔ بل کہ کلی تاریخی حقیقت کے مقابلے میں جو کردار اختیار کر رکھا ہے وہ بہت منظم اور مربوط ہے۔"(۱۲)

ایڈورڈ سعید کے اس تجزیے کی روشنی میں دیکھا جائے تو حبس میں پیش کی گئی اسرائیلی جارحیت محض ایک ریاستی پالیسی نہیں بلکہ ایک عالمی طاقت کے سرپرست بیانیے کا تسلسل بن کر سامنے آتی ہے۔ حسن منظر نے ایریئل شیرون کے کردار کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ جب ظلم کو عالمی تائید حاصل ہو جائے تو وہ صرف سیاسی یا عسکری سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ فرد کی نفسیات، اخلاقیات اور لاشعور تک سرایت کر جاتا ہے۔ ناول میں شیرون کے ذہنی مناظر محض اس کے ذاتی جرائم کا عکس نہیں بلکہ اس پورے استعماری نظام کی علامت ہیں جس نے فلسطینیوں کی نسل کشی کی فکری اور عملی بنیاد رکھی۔

حبس میں امریکہ اور مغرب کی پشت پناہی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا یہ احساسِ استثنا شیرون کی نفسیات کا بنیادی جزو بن جاتا ہے۔ وہ خود کو ایک ایسے حاکم کے طور پر دیکھتا ہے جو نہ جواب دہ ہے اور نہ قابلِ احتساب۔ تاہم حسن منظر کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ اس عالمی ناانصافی کو کسی براہِ راست سیاسی تقریر کے بجائے ایک تدریجی نفسیاتی انہدام کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جہاں طاقتور فرد خود اپنے ہی لاشعور کے ہاتھوں سزا پانے لگتا ہے۔

فلسطین میں ظلم و جبر کی داستان ایک طویل اور المناک تاریخ رکھتی ہے، اور بسا اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اندھیری رات کبھی اختتام کو نہیں پہنچے گی۔ موجودہ دور میں دنیا کی کل آبادی کا کم و بیش اکیس فیصد مسلمان ہونے کے باوجود نہ تو یہ آبادی اسرائیلی جارحیت کو روک سکی اور نہ ہی فلسطین کی کوئی مدد کر سکی۔ ایسے نازک حالات میں، جب فلسطین کو عالمی حمایت کی شدید ضرورت ہے، ناول میں یہ خاموشی اجتماعی اخلاقی بحران کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ جو مسلم حکمرانوں کے لیے سوالیہ نشان ہے۔

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان تنازعے کی بنیادی وجہ بیت المقدس ہے، جس پر اسرائیل غاصبانہ قبضہ چاہتا ہے۔ ابتدا سے آج تک یہ شہر اس تصادم کا مرکزی محور رہا ہے۔ فلسطینی عوام بیت المقدس کو اپنی عزت، شناخت اور جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں اور اس کے تحفظ کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ بیت المقدس نہ صرف فلسطینیوں کا مقدس مقام ہے بلکہ پوری مسلم دنیا اسے قبلۂ اول مانتی ہے اور کسی بھی صورت اس پر اسرائیلی قبضے کو قبول نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ایریئل شیرون نے اقتدار سنبھالتے ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ جو کام اس کے پیش رو انجام نہ دے سکے، وہ ہر صورت مکمل کرے گا۔ اسی عزم کے تحت اس نے بیت المقدس کے محافظوں اور چاہنے والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ناول حبس میں ایریئل شیرون کی داخلی آواز اس جارحانہ ذہنیت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

"وزیراعظم بنتے ہی میں اس مسجد میں گیا جو دیوار گریہ کے نزدیک ہے اور ان عربوں کا جو کچھ بھی ہے جسے یہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کہتے ہیں میرے اس ایک عمل سے انہیں پتہ چل گیا ہو گا۔۔۔ مجھ میں اس کمزوری کو نہ ڈھونڈیں جوان کے صلاح الدین میں تھی میں مٹی کا انسان ہوں اس میں جذبات کیسے ہو سکتے ہیں۔"(۱۳)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ شیرون نہ صرف انسانی جذبات سے عاری ہے بلکہ وہ دانستہ طور پر ظلم کو اپنی طاقت کی علامت سمجھتا ہے۔ اسرائیل انتقام کی آگ میں اس قدر جل چکا تھا کہ اسے اپنے مذہب کی اصل تعلیمات بھی یاد نہ رہیں۔ حالانکہ دنیا کا کوئی بھی مہذب دین یا معاشرہ انسانیت پر ظلم اور بے گناہوں کے خون کو جائز قرار نہیں دیتا۔ بائبل بھی رحم، انسان دوستی اور عدل کا درس دیتی ہے، مگر شیرون جیسے کردار کے لیے یہ تعلیمات ناقابل قبول تھیں۔ حسن منظر اسی فکری انحراف کو یوں بیان کرتے ہیں:

"بائبل کو یا تو سرے سے ختم کر دیا جائے یا ایڈٹ کی جانی چاہیے کیونکہ اس میں فلسطین کا جگہ جگہ ذکر ہے۔۔۔ وہاں اس کی تعلیم ہوئی اور اس کے دماغ میں خناس سمایا کہ ازرے ائیل کو مذہب سے بے تعلق ملک ہونا چاہیے۔۔۔"(۱۴)

ناول میں شیرون پر نازل ہونے والے ٹڈیوں، مینڈکوں اور چوہوں کے مناظر محض فریبِ نظر نہیں بلکہ مذہبی اساطیر سے جڑی ہوئی علامتی سزائیں ہیں۔ یہ عذاب اس امر کی علامت ہیں کہ جب ظلم حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو سزا تاریخ، فطرت اور لاشعور تینوں سطحوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ ہسپتال کے بستر پر پڑا ہوا شیرون جسمانی طور پر تو مفلوج ہے، مگر ذہنی طور پر اپنے ہی کیے مظالم کے عذاب میں گھرا ہوا ہے۔ حسن منظر نے شیرون کے ذہنی انتشار کو نہایت مؤثر علامتوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ٹڈیوں کا جسم میں داخل ہونا، مینڈکوں کا پانی اور فیڈر میں تیرنا، اور چوہوں کا کمرے میں پھیل جانا یہ سب مظاہر اس کے ماضی کے جرائم کا استعارہ بن جاتے ہیں:

"ٹڈیاں میرے کپڑوں کے اندر پہنچ چکی ہیں کچھ میرے کھلے ہوئے منہ اور نتھنوں میں جارہی ہیں کچھ کیتیوں کی جنی آنکھوں پر بیٹھ گئی ہیں اور اپنی سونڈیں میری آنکھ کے ڈھیلوں پر پھیر رہی ہیں پوٹوں پر ان کا وزن میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔۔۔ اف میری برداشت کتنا ساتھ دے گی۔"(۱۵)

یہ علامتی عذاب اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ طاقت، جبر اور نسلی تفاخر بالآخر انسان کو اس کے اپنے باطن کے ہاتھوں سزا دلواتے ہیں۔ جو شخص کبھی نہتے فلسطینیوں پر ظلم کرتے وقت کسی قسم کی ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا، وہی اب خوف، اذیت اور پشیمانی کے حصار میں گھرا ہوا ہے۔

حسن منظر نے شیرون کی ذہنی کشمکش کو نہایت مؤثر علامتی نظام کے ذریعے پیش کیا ہے۔ چوہوں، ٹڈیوں اور مینڈکوں کا پھیلاؤ دراصل اس کے پھیلائے ہوئے فساد اور خون ریزی کا استعارہ ہے۔ بسترِ مرگ پر پڑا ہوا یہ شخص اب معافی مانگنے پر مجبور ہے، مگر وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ طاقت کے نشے میں چور انسان جب انجام کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے تو اسے اپنی کمزوری کا ادراک ہوتا ہے، مگر یہ ادراک بہت دیر سے ہوتا ہے۔

ناول کا ایک اہم فکری پہلو شیرون کی نسلی برتری اور تعصب پر مبنی سوچ ہے۔ وہ انسانی نفسیات، مساوات اور مشترکہ انسانیت جیسے تصورات کو یکسر مسترد کر دیتا ہے:

"ہم نے انسانی نفسیات کی کتابوں کو غیر اہم بنا دیا ہے آف نو ریلی وینس اہم بات یہ ہے کہ دنیا میں دو قومیں ہیں۔۔۔۔ ایک حاکموں کی دوسری محکوموں کی، سفید قوم حکومت کرنے کے لیے بنائی گئی ہے باقی رنگتوں والے ان کے تابع فرمانی کے لیے۔۔۔۔۔ اگر سب ایک جیسے حقوق لے کر پیدا ہوئے ہوتے تو یہ طرح طرح کی رنگتیں، ہونٹ، ناک اور بال کیوں حیاتیات کے عمل نے بنائے ہم قوم باد سفید ہیں یہودانے ہمیں حکومت کرنے کے لیے بنایا ہے۔۔۔"(۱۶)

یہ نظریہ دراصل استعمار، نسل پرستی اور فسطائی فکر کا نچوڑ ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے اخلاقی زوال اور تباہی کی طرف بڑھتے ہیں۔اس کا داخلی کرب اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب وہ اپنے گرد پھیلی تباہی کو دیکھ کر بے بسی سے پکار اٹھتا ہے:

"پچاس ساٹھ چوہے تو اس کمرے میں مرے پڑے ہیں، کیا ہماری زندگی کی سڑک تو یہی ختم ہوتی ہے؟ موشے کے خدا ہمیں بچالے۔" (۱۷)

وہی ایریئل شیرون جو کبھی غرور، طاقت اور برتری کے زعم میں مبتلا تھا، آج بسترِ مرگ پر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے، مگر اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ حسن منظر اس مقام پر یہ گہرا فکری نکتہ واضح کرتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، ایک دن اس کے اعمال کی سزا کا وقت ضرور آپہنچتا ہے۔ مفلوج حالت میں مبتلا شیرون اپنے کیے کے عذاب میں اس طرح گرفتار ہے کہ وہ تمنّا کرتا ہے کہ اگر اسے دوبارہ صحت مل جائے تو وہ فلسطینیوں کو ان کے گھروں میں واپس لوٹا دے گا، کسی پر گولی نہیں چلائے گا اور ظلم کا راستہ ترک کر دے گا۔ مگر یہ خواہشات اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ طاقت کے نشے میں کیے گئے فیصلوں کا کفارہ وقت گزر جانے کے بعد ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ناول حبس میں جہاں نثر کے ذریعے تلخ حقیقتیں بیان کی گئی ہیں، وہیں شعری انداز میں بھی فلسطین کے دکھ کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک بوڑھے یہودی کی زبانی کہی گئی نظم نہ صرف فلسطین کی تباہ شدہ حالت کا نوحہ ہے بلکہ صہیونی فکر پر احتجاج بھی ہے۔ یہ حصہ ناول کو فکری گہرائی اور انسانی وسعت عطا کرنے کے در وا کرتا ہے۔

نظریاتی سطح پر حبس ایک منفرد متن کے طور پر سامنے آتا ہے، جہاں فرائیڈ کے تصورِ لاشعور، احساسِ جرم اور repetition compulsion کے ذریعے ایک طاقتور مگر اخلاقی طور پر کھوکھلے فرد کی نفسیاتی شکست کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایریئل شیرون کا کردار اس بات کی مثال ہے کہ جب ریاستی جبر اور نسلی برتری کو اخلاقی جواز فراہم کر دیا جائے تو وہ بالآخر فرد کے لاشعور میں ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں پال ریکوئر کا تصورِ شر بھی پوری معنویت کے ساتھ منطبق ہوتا ہے۔ ناول حبس صرف ایریئل شیرون کی نفسیاتی شکست کی داستان نہیں بلکہ یہ عالمی استعمار، مغربی دوہرے معیار اور مسلم دنیا کی بے حسی پر ایک گہرا سوالیہ نشان بھی ہے۔ حسن منظر نے پسے ہوئے طبقوں، خصوصاً فلسطینی عوام کے حق میں ایک توانا اور بامعنی آواز بلند کی ہے۔ یہ ناول اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ظلم چاہے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، بالآخر اپنے انجام سے نہیں بچ سکتا۔ ناول کا اختتام اگرچہ حزن و ملال سے لبریز ہے، مگر اس میں حوصلے، جد و جہد اور مزاحمت کی ایک مدھم مگر پائیدار روشنی موجود ہے۔ حبس اس امر کی علامت ہے کہ اندھیروں کے مقابلے میں روشنی چاہے کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، بالآخر غالب آتی ہے۔ ۲۰۲۳ء میں غزہ پر ہونے والی کارروائیوں نے اس ناول کی معنویت کو مزید تازہ کر دیا ہے اور یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حبس محض ماضی کا نوحہ نہیں بلکہ ہر دور کے فلسطین، جبر کی ہر صورت اور ہر استعماری نظام کے خلاف انسانی ضمیر کی زندہ دستاویز ہے۔ یوں ناول "حبس" ہذیانی شعور میں تشکیل پانے والی شیرون کی وہ آپ بیتی ہے جو بسترِ مرگ پر وجود میں آتی ہے، لاشعور ضمیر کی عدالت بن کر خود کلامی کی تکنیک میں تاریخ میں کیے گئے جرائم کا محاسبہ کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، (ابتدائیہ) حبس از حسن منظر، بک کارنر، جہلم، جولائی، ۲۰۲۳ء، ص ۳۴

۲۔ Sigmund Freud, The Interpretation of Dreams. Translated by James Strachey, vol. 5, The Standard Edition of the Complete Psychological Works of Sigmund Freud, Hogarth Press, 1953, p. 613.

۳۔ حسن منظر، حبس، ص ۳۰

۴۔ Sigmund Freud, Beyond the Pleasure Principle, Translated by James Strachey, W.W. Norton & Company, 1961, p.xiv

۵۔ حسن منظر، حبس، ص ۲۸

۶۔ ایضاً، ص ۴۰

۷ ۔ایضاً، ص۱۷

۸۔ایضاً، ص۲۵

۹۔ایضاً، ص۴۷/۴۸

۱۰۔ Paul Ricoeur, The Symbolism of Evil (Part I: The Defilement Symbolism), Translated by Emerson Buchanan, Beacon Press, Boston, 1967, p. 24

۱۱۔ حسن منظر، حبس، ص۳۳/۳۲

۱۲۔ایڈورڈ سعید، مسئلہ فلسطین، مترجم: شاہد حمید، (لاہور، ایلفا بَراوؤ، ۱۹۹۱ء)، ۱۴۲

۱۳۔ حسن منظر، حبس، ص۸۳

۱۴۔ایضاً، ص۲۲۹

۱۵۔ایضاً، ص۹۳

۱۶۔ایضاً، ص۲۶۲

۱۷۔ایضاً، ص۱۴۱